188824
٩١٣ s ٢
ع - ٥

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188824

UNIVERSAL
LIBRARY

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر

مقالہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(دسمبر ۱۹۳۷ء)

از

مولانا غلام یزدانی صاحب، محکمۂ آثار قدیمہ

حیدرآباد دکن

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

طبع اول ۱۹۳۹ء ۱۵۰۰
مطبوعہ جدید برقی پریس، دہلی

دیباچہ

ایک صاحب بصیرت شاعر کہتا ہے:

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانہ

ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

اس میں شک نہیں کہ جو پرانی چیزیں خصوصاً ٹوٹی پھوٹی عمارتیں زمانے کے جھٹکے کھا کر بچ رہی ہیں ان کا ہر ذرہ زبان حال سے عہد رفتہ کی داستان سناتا ہے، لیکن اس زبان کا سننا اور سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے لئے غیر معمولی حیرہ اور نظر کی ضرورت ہے۔ بڑے صبر اور محنت سے ماضی کی یہ نشانیاں تلاش کی جاتی ہیں اور ان کی اصلیت کا پتہ چلایا جاتا ہے اور بڑی دیدہ ریزی سے باریک سے باریک کڑیاں جوڑ کر واقعات کا سلسلہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ زنجیر جو آثار قدیمہ کے ماہر اور مورخ کی متفقہ کوشش سے بنتی ہے حال کو ماضی سے ملا کر خواب ہستی کے منتشر اجزا میں ربط پیدا کر دیتی ہے۔

ہندوستان آج کل سیاسی تغیرات کے دور سے گذر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فضا علمی تحقیقات کے لئے سازگار نہیں ہے۔ سیاست کے نقار خانے میں علم کے طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اگر علم و حکمت کا تھوڑا بہت چرچا ہے بھی تو سیاسی اور معاشی مصالح کا تابع ہے۔ حق کے آئینے کو اغراض کے زنگ نے دھندلا کر دیا ہے۔

پھر بھی چند خدا کے بندے ہیں جو اس شور و شر سے الگ خلوص اور خاموشی سے علم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد کی ذات کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ موصوف نے ہماری دعوت کو قبول فرما کر یہ مقالہ پڑھا جو علمائے آثار کی آج تک کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اس کی اشاعت بلا شبہہ نہ صرف ہمارے سلسلہ مطبوعات میں بلکہ کل اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

سیّد عابد حسین

ناظم اردو اکادمی

جنوری ۱۹۳۹ء

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر

سفر کی سہولت نے دنیا کی طنابیں ملا دی ہیں اور مختلف ممالک کے حالات کو ایسا واضح کر دیا ہے کہ سندباد کے قصوں کی گنجائش نہ رہی۔ اب جو بات منہ سے نکالنی ہوتی ہے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ لوگ اس کو من گھڑت تو نہ سمجھیں گے۔ آثار کی تحقیق بھی ایک وسیع علم بن گیا ہے۔ اس لیئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آج آپ کے سامنے جن امور پر بحث کی جائے گی ان کا تعلق زیادہ تر ہندوستان کی قدیم عمارتوں سے ہے۔ ضمناً سنگتراشی اور نقاشی کا بھی ذکر آجائے گا۔ لیکن تقریر کا موضوع خاص طور سے قدیم عمارات ہی رہیں گی۔

ہندوستان کے طول و عرض جغرافی کیفیات اور باشندوں کے مختلف النسل

ہونے کے اعتبار سے اس وسیع جزیرہ نما کی قدیم عمارات میں یکسانیت اور ہم آہنگی تلاش کرنا نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ تاہم مذہبی عقائد، سیاسی نظام، اور معاشی حالات انسان کے خیالات اور طرزِ زندگی کو بہت کچھ سمو دیتے ہیں اور اس لیے ہم کو ہندوستان کے مختلف صوبوں کے آثارِ قدیمہ میں مماثلت یا مشابہت کے وجوہ بیان کرنے میں مذہب اور تمدن کے اثرات کو پیش کرنا ہوگا۔

سندھ میں جو قدیم آثار گذشتہ دس بارہ سال کے عرصہ میں دریافت ہوئے ہیں ان سے ایک اعلیٰ درجہ کے تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ لوگوں میں خاصے بڑے شہر بنانے کی صلاحیت تھی۔ مکان جس مسالے سے بنائے جاتے تھے وہ پائدار تھا۔ علاوہ پختہ اینٹوں کے گچ اور قیر (Bitumen) کے بھی آثار پائے گئے ہیں۔ مکانات میں موریوں کا انتظام تھا۔ دروازوں پر محراب کے نشانات بھی نظر آئے ہیں۔ زینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکانات دو منزلہ بنتے تھے۔ ظروف اور مہریں جو دستیاب ہوئی ہیں اُن سے بھی ایک بلند معیار کی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغربی ایشیائی ممالک کے قدیم تمدّن سے گہرا تعلق تھا۔ سندھ کے اس قدیم تمدن کے آثار پنجاب کے ضلع منٹگمری اور امبالہ اور کاٹھیاواڑ کے بعض حصص میں پائے گئے ہیں۔ مہروں پر جو کتبے ہیں ان کی بھی بعض ماہرین نے تعبیر کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ سندھ کی یہ تہذیب آیا کل ہندوستان کی کہلائی جاسکتی ہے یا

سندھ کے جغرافیائی حالات کے مدنظر سمیری تہذیب کے اتصال سے پیدا ہوگئی تھی ۔ اس تمدن کو کل ہندوستان سے منسوب کرنے میں تامل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اول تو اس کے آثار ملک کے اندرونی حصوں میں نہیں پائے جاتے ۔ علاوہ ازیں اس واقعہ کے وجوہ سمجھ میں نہیں آتے کہ جب ملک میں چار پانچ ہزار سال قبل از مسیح فن تعمیر اور مدنیت کا معیار ایسا بلند تھا تو پھر بعد میں کیوں غائب ہوگیا۔ حالانکہ بابل، نینوا اور ایشیائے کوچک میں اس کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

سندھ کے تمدن کے بعد آریائی تہذیب کی جھلک ہم کو ان کی مقدس کتابوں میں ملتی ہے ۔ اس نسل کے لوگ ہندوستان میں کوئی دو ہزار سال قبل از مسیح سے لے کر پندرہ سو سال قبل از مسیح تک یا اس کے بعد بھی آتے رہے۔ یہ لوگ نہایت ذہین تھے اور مذہبی اور علمی میلان رکھتے تھے ۔ زندگی نہایت سادہ تھی ۔ کھیتی باڑی کرتے تھے اور مویشی چراتے تھے اور گھاس پھوس یا مٹی کے مکانات میں رہتے تھے جیسا کہ اب تک دیہات میں پائے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اعلیٰ علمی اور مذہبی کارناموں کے باوجود ہم کو ان کی مدنیت کے متعلق ایسے آثار نہیں ملتے جیسا کہ سندھ وغیرہ میں پائے گئے ہیں ۔ آریا نسل کے فاتحوں نے اپنی مقدس کتابوں میں ہندوستان کے قدیم باشندوں کا حقارت آمیز الفاظ میں ذکر کیا ہے اور ذات پات کے

امتیازات بھی اسی حاکمی محکومی یا رنگ و نسل کے فرق کی وجہ سے پیدا ہو گئے۔
آریائی نسل کے لوگوں کے آنے سے کئی ہزار برس پہلے ہندوستان میں دراوڑی
نسل کے لوگ بھی داخل ہو چکے تھے۔ موجودہ تحقیق کے لحاظ سے ان کا اصلی
وطن بحیرۂ روم کے کنارے خیال کیا جاتا ہے۔ اور ہندوستان میں یہ سندھ کے
راستے سے داخل ہوئے تھے کیونکہ بلوچستان میں ایک زبان برھوئی نامی
اب تک بولی جاتی ہے جو دراوڑی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اس نسل کے لوگ
آریاؤں کے آنے سے پہلے غالباً ہندوستان کے تمام حصص میں پھیلے
ہوئے تھے۔ لیکن آریاؤں کے آنے کے بعد یا تو بہ حیثیت ادنیٰ پیشہ وروں
کے ان کے اطاعت گذار بن گئے یا سمٹ کر جنوبی ہند چلے آئے۔ جہاں
جغرافیائی رکاوٹوں کی وجہ سے آریائی اثر بہت دیر میں اور بہت کم ہوا۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی تہذیب جب
پھیلی تو اس وقت غالباً وہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے۔ اس نظریہ کے
باور کرنے کے وجوہ یہ ہیں کہ سندھ میں جو اس زمانے کی قدیم قبور دریافت ہوئی
ہیں وہ دکن اور جنوبی ہند کی قبور سے جہاں دراوڑی قومیں اب تک آباد ہیں
ملتی جلتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض صنعت کی چیزیں بھی مثلاً منکے اور ان پر ایک
خاص قسم کے سفیدے کا کام دکن اور جنوبی ہند کے قدیم مقامات کی کھدائی
میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اور سندھ میں بھی اس قسم کے منکے اور سفیدے کا

کام پایا گیا ہے۔ سرجان مارشل اور ان کے لائق رفقاء کو سندھ کی کھدائی میں ایک قسم کے لاجورد کے مثلث نما منکے بھی ملے ہیں جو دکن کی کھدائی میں بھی پائے گئے ہیں۔ قدیم زمانے کے چقماقی اوزاروں میں بھی بے حد مماثلت موجود ہے۔ منکوں کی صنعت کے لیے تو دکن ابتدائی تاریخی زمانہ میں مشہور تھا چنانچہ یونانی مورخین نے قدیم شہر پائی تھن (Paithan) اندھرا بادشاہوں کی راجدھانی کا جب ذکر کیا ہے تو یہ بھی لکھا ہے کہ قیمتی پتھروں کے منکے بطور دساور غیر ممالک کو جاتے تھے۔ فادر ہیراس نے تو موہن جوداڑو کے تمام کتبات کی تعبیر بھی دراوڑی زبان کی مدد سے کر دی ہے۔

فادر ہیراس کے نظریّہ کے صحیح اور غلط ہونے کا حال تو آئندہ تحقیقات سے معلوم ہوگا لیکن اس میں شک نہیں کہ جو قوم اُس وقت سندھ میں آباد تھی اس کے مذہبی عقائد رسوم اور صنعتیں قدیم دراوڑی قوموں کے عقائد رسوم اور صنعتوں سے مشابہ ہیں۔

آریاؤں کی نسبت فرگسن نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فن عمارت میں اس نسل کے لوگوں نے کسی ملک میں بھی کمال حاصل نہیں کیا۔ یہ رائے ایک حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے لیکر پانچ سو سال قبل از مسیح تک کے زمانہ کو اگر ہم دیکھیں تو مذہب، فلسفہ، شاعری اور بہت سے علوم میں ہندوستان کے آریائی نسل کے لوگوں کا کمال درجہ

اعلیٰ پر نظر آتا ہے لیکن جب ان کے مکانات کی تلاش کرتے ہیں تو سوائے گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے یا مٹی کے گھروندوں کے پختہ اینٹیں بھی ہم کو مسیح سے چار سو سال پہلے کی نہیں ملتیں۔

ہندوستان کے فن تعمیر اور متعلقہ صنعتوں کی تاریخ کی تدوین میں بدھ مت کا آغاز خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ابتدائی زمانہ کی جو عمارتیں موجود ہیں یا دریافت ہوئی ہیں وہ سب اسی مذہب یا اس کے پیروؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ برہمنوں کے مذہبی فلسفہ کی گہرائی اور ذات پات کے امتیازات ایسی اقوام کو جو آریائی نہ تھیں ضرور شاق گذرتے ہوں گے۔ گوتم کی تعلیم کا اس وقت کی ہندو مت کی تعلیم سے مقابلہ کرنا تو علماء اور ماہرین کا کام ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ مذہب اپنی انسانیت، ایثار اور وسعت نگاہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور اس کا عالم گیر اثر ہندوستان اور اس کے متصلہ ممالک میں جلد پھیل گیا۔ خود گوتم کا زمانہ چھٹی اور پانچویں صدی قبل از مسیح سمجھنا چاہیئے۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت سیسونا گا خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے۔ جن کی راجدھانی ضلع گیا کی پہاڑیوں میں راجگیر تھی۔ پنجاب کا شمال مغربی حصہ اور سندھ ایران کی حکومت میں داخل تھے۔ اس زمانہ کے شمالی ہندوستان کے آثار میں راجگیر کے بڑے بڑے پتھروں کی دیواریں ہیں جو جنوبی ہندوستان میں بھی ضلع رائچور میں دریافت

ہوئی ہیں اور بحیرۂ روم سے متصل ممالک میں بھی بکثرت موجود ہیں اور جن کو پتھروں کے غیر معمولی وزن اور مساحت کے لحاظ سے عفریتی دیوار (Cyclopean Wall) کہا جاتا ہے۔ اب اس امر کا فیصلہ کہ راجگیر کی عفریتی دیوار دراوڑی نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہے یا آریائی نسل والوں کا کارنامہ ہے، اس طرح ہو سکتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس قسم کی تعمیر شمالی ہند میں جہاں آریاؤں کا زیادہ دور دورہ رہا ہے عام ہے یا جنوبی ہند میں۔ مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے سیسوناگا خاندان کی نسل کے بارہ میں بھی جن کے عہد میں یہ دیوار تعمیر ہوئی غور کر لینا چاہیے۔ وِنسنٹ سمتھ اور بعض مورخین کی یہ رائے ہے کہ سیسوناگا خاندان آریائی نسل کا نہ تھا جنوبی ہند میں بڑے بڑے پتھروں کا استعمال اول تو زمانۂ ماقبل تاریخ کی قبورمین جن کو (Dolmen) اور (Cairn) وغیرہ کہا جاتا ہے۔ عام طور سے پایا جاتا ہے علاوہ ازیں تاریخی زمانہ کے قلعوں میں بھی جنوبی ہند کے معماروں نے بڑے بڑے پتھروں کے استعمال میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ حقیقت میں عفریتوں کا کارنامہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مثلاً قلعۂ رائچور کی قدیم دیوار میں ایک پتھر کی سل ۱۴ فٹ ۸ انچ لمبی نصب ہے۔ اتنی بڑی سل دنیا کی کسی عفریتی دیوار میں نہیں ہے۔ شمالی ہند میں اس قسم کی دیواریں نادر ہیں اس لیے یہ نتیجہ بدیہی ہے کہ راجگیر کی قدیم دیوار جو سیسوناگا خاندان کے راجاؤں کے عہد میں تعمیر ہوئی دراوڑی

نسل کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔

۳۲۶ سال قبل از مسیح سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس حملہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایرانی اثر کے علاوہ یونانی اثر بھی قائم ہو گیا۔ سکندر کے حملہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مغربی ایشیا کے یونانی بادشاہ سیلوکس نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا لیکن اس وقت مگدھ میں موریا خاندان کا بادشاہ چندر گپت راج کرتا تھا۔ اور اس کی حکومت تمام شمالی ہند پر پھیلی ہوئی تھی۔ یونانیوں کو اس مرتبہ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اور صلح جن شرائط پر ہوئی ان میں ایک شرط کے تحت سلوکس کی بیٹی کی شادی چندر گپت سے ہو گئی۔ سلوکس نے چندر گپت کے دربار میں مگاستھنیز نامی ایک سفیر بھی بھیجا۔ پاٹلی پتر اس زمانہ میں دارالخلافہ تھا۔ مگاستھنیز نے اس شہر کے مدافعی استحکامات کی ضمن میں لکھا ہے "چاروں طرف لکڑی کا ایک مستحکم حصار تھا۔ بادشاہ کا محل بھی لکڑی کا بنا ہوا تھا" اور کھدائی سے جو نشانات اور آثار اب حال میں برآمد ہوئے ہیں ان کے متعلق ڈاکٹر سپونر مرحوم کی یہ رائے تھی کہ پرسی پولس کے ایرانی بادشاہوں کے محل کی نقل تھا اور ایرانی صناعوں نے ہی اس کو تعمیر کیا تھا۔ چندر گپت کی عملداری کابل، ہرات، اور قندھار تک پھیل گئی تھی اور چونکہ یہ علاقے پہلے ایرانی حکومت کے ماتحت تھے۔ اس لیے ایرانی صناعوں اور معماروں کا وہاں سے طلب کیا جانا کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں

یونانی بادشاہ سیلوکس سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے ۔ اور مغربی ایشیا اور ہندوستان میں اس وقت آمد و رفت اور تجارتی تعلقات کی بہت سی دلیلیں موجود ہیں ۔ ایرانی تہذیب کے اثر کی ایک اور مثال کھروشتی طرز تحریر سے بھی نمایاں ہے جو آرمیکی خط کی ایک قسم ہے ۔

چندر گپت کے زمانہ کی عمارتوں کا حال جہاں تک کہ مگاستھنیز کی تحریرات سے معلوم ہوا ہے یا کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کے محلات اور اہم عمارتیں لکڑی کی ہی بنتی تھیں ۔ اور سنگین عمارتوں کا رواج نہ تھا ۔ بعض اوقات ستونوں کے نیچے استحکام کی غرض سے یا دیمک کے اثر سے عمارت کو محفوظ رکھنے کے لیے پتھر کی بندش دیدیا کرتے تھے ۔

چندر گپت کے پوتے راجہ اشوک کا عہد ہندوستان کے آثار قدیمہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ کیونکہ اسی کے عہد سے سنگین عمارتوں کا آغاز ہوا ۔ اشوک کے زمانہ کی بہترین یادگار وہ لاٹھیں ہیں جو اس نے اپنی مملکت میں جابجا قائم کیں ۔ اول تو یہ لاٹھیں اپنے طول کے لحاظ سے جو چالیس پچاس فیٹ تک ہے اس زمانہ کے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں علاوہ ازیں حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ان کی نقل و حرکت اور نصب کرنے کا انتظام کیا جاتا ہوگا ۔ ان لاٹھوں کو اس صفائی سے تراشا گیا ہے اور ایسی جلا دی گئی ہے کہ سنگتراشی کے فن میں کمال مشاقی معلوم ہوتی ہے ۔ بعض لاٹھوں کے بالائی

حصے پر جانوروں کی موتیں اور نقش و نگار بھی ہیں چونکہ ان میں اور قدیم ایرانی تماثیل اور نقوش میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے اس لیے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ لاٹھوں کو ایرانی صناعوں ہی نے بنایا ہوگا۔ اشوک کی مملکت کی وسعت اور بدھ مت کے عام رواج کے لحاظ سے ایرانی صناعوں کا بڑے بڑے تعمیری کاموں میں شریک ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ان ہی نقوش میں بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جو ایران میں نہیں ہیں۔ اس لیے گمان غالب یہی ہے کہ لاٹھوں کی تعمیر صرف ایرانی لوگوں سے ہی عمل میں نہیں آئی بلکہ اہل ملک بھی اس میں شریک تھے۔ لاٹھوں کے علاوہ اس زمانہ کی یادگار بارآبار کے غار اور سارناتھ کا سنگین کٹہرا ہے جو ایک ڈال کا تراشا ہوا ہے۔ بارآبار کے غاروں کی دیواروں کی جلا اس غضب کی ہے کہ ہاتھ رکھے سے پھسلتا ہے۔ ایرانی اثر ثابت کرنے والے اشوک کے کتبوں کو بھی استدلال میں پیش کرتے ہیں کہ یہ ہخامنشی (Achaemenian) بادشاہوں کے چٹانوں پر کندہ کئے ہوئے احکام کی نقل ہیں۔ علاوہ ازیں اشوک کے بعض منادات میں زرتشت کے کلام کا بھی انداز پایا جاتا ہے۔ ایرانی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کافی قرائن موجود ہیں کہ ہندوستان میں بطور خود سنگتراشی کا فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ لیکن ماہرین چونکہ دراوڑی نسل کے

لوگ تھے اس لیے ابتدا میں مذہب اور رنگ کے قیود کی وجہ سے کوئی اعلیٰ پیمانہ پر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور بدھ مت کی رواداری نے جب ان کو اپنی مقدس سنگتوں کے آغوش میں لے لیا تو ان کے کمال کے جوہر چمکے۔ سر جان مارشل کی رائے ہے کہ سنگتراشی سے پہلے زرگری اور ہاتھی دانت پر منبت کاری کی صنعتیں فروغ پا چکی تھیں اور سنگتراشی میں جو نمونے ہمیں ملتے ہیں وہ ان دونوں صنعتوں سے نقل کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں علاوہ ازیں ہندوستان کی ابتدائی سنگتراشی میں ایک قسم کی صفائی اور دیدہ ریزی ایسی موجود ہے جو دوسرے ملکوں کے سنگتراشی کے نمونوں میں ہم کو نہیں ملتی۔

اشوک کا زمانہ تیسری صدی قبل از مسیح کا وسطی حصہ سمجھنا چاہیے۔ اشوک کی وفات کے بعد مگدھ کی سلطنت میں بہت ضعف آگیا۔ اور شمال غرب اور پنجاب میں یونانی، سیتھی، اور ایرانی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ لیکن بدھ مت سلطنت کے ضعف کے بعد بھی ترقی پذیر رہا۔ اور دوسری صدی قبل مسیح کی عمارتوں میں سانچی اور برہوت کے اسٹوپا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سٹوپا کی تعمیر میں تو فن کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ مٹی کے ایک مدور تودے کو اینٹ یا پتھر کی چنائی سے بند کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے گرد جو سنگین کٹہرے اور دروازے نصب کیے گئے ہیں ان کی سنگتراشی قابل تعریف ہے۔ برہوت کا اسٹوپا مسمار ہو چکا ہے لیکن اس کے بعض حصص

کلکتہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ سانچی کا سٹوپا البتہ قائم ہے اور اس کی مرمت ریاست بھوپال کی جانب سے سرجان مارشل کی نگرانی میں نہایت عمدہ طور سے عمل میں آئی ہے۔ ان دونوں سٹوپاؤں کے کٹہروں اور دروازوں پر بدھ کی زندگی کے قصے، اصلی اور خیالی جانوروں کی تصویریں مذہبی علامات اور شاید بانیوں کے مجسمے بھی کندہ ہیں۔ انسانی صورت میں ناگا قوم کے لوگ نمایاں ہیں جو دراوڑی نسل کے تھے۔ برہوت کے سٹوپا پر برہمی کتبوں کے علاوہ کہروشتی رسم خط کے کتبے بھی ہیں۔ مزید برآں ایسی حیوانی تماثیل اور نقش و نگار موجود ہیں جن سے ایرانی اور یونانی اثر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ فن کے لحاظ سے دونوں جگہ کے کام کی نوعیت مختلف ہے۔ برہوت کا کام ابتدائی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مجسموں کے نیچے کے حصہ میں ٹانگوں کو بنگا کر دیا ہے۔ تناسب کی بھی کمی ہے۔ اور ایک قسم کا بھدّا پن ہے۔ اس کے مقابل میں سانچی کی سنگتراشی میں صفائی اور حسن بدرجہ کمال موجود ہے اور جو مناظر نبت کیے گئے ہیں ان میں تماثیل کی جسامت، حرکت اور احساسات کا اظہار نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اور ترتیب بھی نہایت عمدہ ہے۔ سانچی کے جنوبی دروازہ پر جو صنعت کے لحاظ سے بہترین سمجھا جاتا ہے ایک کتبہ آندھرا خاندان کے بادشاہ سری ساتکرنی کا ہے جس کا زمانہ اس راجہ کے اور مقامات کے کتبوں کے

لحاظ سے دوسری صدی قبل از مسیح مانا گیا ہے۔ سانچی کے کتبے میں سات کرنی کی مملکت کے کاریگروں کا ذکر ہے۔ یہ کتبہ ہندوستان کی فنون لطیفہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی قبل از مسیح میں دکن میں جہاں وراوڑی قومیں آباد تھیں سنگتراشی ایسے کمال کو پہنچ گئی تھی کہ وہ شمالی ہند کے صناعوں کے کام پر غالب تھی۔ اجنٹا کے دس نمبر کے غار میں جو بائیں جانب کی دیوار پر تصاویر ہیں ان پر بھی ایک کتبہ دوسری صدی قبل از مسیح کا ہے اور تصاویر میں جو انسانی شکلیں دکھائی گئی ہیں وہ ناگا قوم کی ہیں جن کے لباس اور زیور سانچی کے ناگاؤں کے لباس اور زیور سے ملتے جلتے ہیں۔ سانچی اور برہوت دونوں جگہ کے ستوپاؤں اور نیز اجنٹا کی ابتدائی تصاویر میں ناگاؤں کا خصوصیت سے دکھایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ بدھ مت کے پیرو ابتدا میں زیادہ تر دراوڑی نسل کے لوگ ناگا وغیرہ تھے اور سنگتراشی اور نقاشی کے فنون میں ان کو دوسری صدی قبل از مسیح میں مہارت تامہ حاصل ہوگئی تھی۔ بدھ مت کی عمومیت یا سیاسی اقتدار کی بنا پر اگر یونانی ایرانی اور سیتھی اثرات کو تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی خود ہندوستان کے فن و کمال کے لحاظ سے بیرونی اثر کو صرف آٹے میں نمک سمجھنا چاہیے۔

میں نے تھوڑی دیر ہوئی آپ کے سامنے بارا بار کے غاروں کا ذکر

کیا تھا۔ پہاڑوں میں قبور بنانے کی رسم مصر میں کئی ہزار برس پہلے عام تھی اور مصری اثر کے ذریعہ ایشیائے کوچک پہنچی جہاں سے ایرانیوں نے اس کو حاصل کیا۔ دارا اور ہخامنشی بادشاہوں کے پہاڑوں میں تراشے ہوئے مقبرے اب تک نقش رستم اور پرسی پولس میں موجود ہیں۔ ایرانیوں کی بدولت پہاڑوں میں مکانات تراشنے کا رواج راجہ اشوک کے زمانہ میں یا اس سے قبل بہار میں شروع ہوا لیکن دکن اور مغربی ہند میں درا وڑی نسل کے لوگوں نے اپنی معابد اور خانقاہوں کی تعمیر میں اس کو ایسا رواج دیا اور ایسے کمال پر پہنچا دیا جو اس قسم کی تعمیر کو نہ مصر میں کبھی حاصل ہوا تھا اور نہ ایران میں ہوا۔ مثال کے طور پر ابتدائی زمانہ کی تعمیر میں بھاجا، بیتل کھورا، اجنتا، بیدسا، ناسک اور کارلی کے معابد ہیں اور قرون وسطیٰ کی تعمیر میں بادامی، ایلورہ اور ایلی فنٹا کے دیول ہیں۔ میں ان عبادت گاہوں کا ذکر ان کی اہمیت کے لحاظ سے ذرا تفصیل سے کروں گا۔

پہلے میں آپ کو ذرا بدھ مت کی مقدس عمارتوں کی نوعیت سے روشناس کراتا ہوں۔ یہ تین قسم کی ہیں۔ اول ستوپا۔ یہ ابتدا میں وہ مدفن تھے جہاں بدھ کی ہڈیاں یا دانت وغیرہ بطور یادگار دفن کیے گئے تھے اور جو بعد میں پرستش گاہ بن گئے۔ ستوپا کی ابتدا ہیئت کے لحاظ سے زمانۂ ماقبل تاریخ کی قبور سے معلوم ہوتی ہے۔ جن کو (Cairn) کہا جاتا ہے۔

کیونکہ (Cairn) کے وسط میں بھی مٹی کا ایک مدوّر تودہ ہوتا ہے اور چاروں طرف بڑے بڑے پتھر نصب ہوتے ہیں۔ سٹوپا میں صرف اتنا فرق ہے کہ مدور مٹی کے ڈھیر کو اینٹوں یا پتھروں سے محصور کر دیتے ہیں اور ارد گرد بڑے بڑے پتھروں کی جگہ سنگین کٹہرے بنا دئے جاتے ہیں بدھ مت کی دوسری قسم کی مقدس عمارتیں چیتیا (Chaitya) کہلاتی ہیں یہ خالص عبادت گاہیں ہیں اور ان میں سرھانے کی جانب اسٹوپا کی ہیئت پرستش کے لیے ہوتی ہے۔ چیتیاؤں کا سطحی نقشہ یورپ کے قدیم معبدوں سے جن کو (Bacilica) کہتے ہیں ملتا جلتا ہے۔ یعنی پچھلا حصہ مدور ہوتا ہے اور سامنے کا حصہ مستطیل۔ بدھ مت چیتیا کے اور یورپ کی قدیم عبادتگاہوں کے سطحی نقشوں کا ماخذ بحر روم کے قدیم معابد کے نقشے ہیں۔ یہ معابد حال میں مالٹا میں دریافت ہوئے ہیں اور سطحی نقشے کے لحاظ سے ان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ جو بتوں کے لیے مخصوص تھا اور دار الاصنام یا خانۂ خدا کہلاتا تھا، مربع ہے۔ اور دوسرا حصہ جو مذبح کہلاتا تھا نیم دائرے کی شکل میں ہے یا قوس نما ہے۔ اور چونکہ دونوں حصے ایک دوسرے سے ملحق ہیں اس لیے (Bacilica) کے سطحی نقشہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ مسلمانوں کے خانۂ خدا یعنی کعبہ کا سطحی نقشہ بھی یہی ہے۔ یعنی حطیم جو کسی زمانہ میں مذبح ہوگا

نیم دائرہ کی شکل میں ہے اور کعبہ مستطیل اور دونوں مل کر مالٹا کے قدیم معابد سے مشابہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کا کعبہ کو بیت عتیق یعنی خدا کا سب میں پرانا گھر سمجھنا بالکل بجا اور درست ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دراوڑی نسل کے لوگوں کا چونکہ ابتدائی مسکن بحیرۂ روم کے ساحل کے ممالک تھے، اس لیے ان کا اس قسم کے معابد سے واقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور بدھ مت کے پیروؤں میں بھی چونکہ دراوڑی نسل کے لوگوں کا عنصر غالب تھا اس لیے چیتیا کا سطحی نقشہ بحیرۂ روم کے قدیم معابد سے مماثل ہونا قرین قیاس ہے۔

بدھ مت کی تیسری قسم کی مقدس عمارتیں وھارا (Vihara) یعنی خانقاہ کہلاتی ہے۔ ان کی ہیئت عام طور سے یہ ہے کہ بیچ میں ایک مربع جگہ بیٹھنے کے لیئے ہوتی ہے اور چاروں طرف بھکشوؤں کے رہنے اور مراقبہ وغیرہ کے لیے حجرے۔ بعد میں سرھانے کی جانب ایک حجرے میں بدھ کی مورت بھی ہوتی تھی تاکہ بھکشوؤں کو توجہ اور استغراق میں مدد ملے۔

مٹی اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے بعد ہندوستان میں چونکہ بانس اور لکڑی کے مکانات کا رواج ہوا اس لیے بدھ مت کے معابد اور خانقاہیں جب پہاڑوں میں تراشی گئیں تو لکڑی کے مکانات کی تعمیر کا تتبع

کیا گیا۔ مثلاً چھتوں کی وضع بانسوں کے ٹہاڑ کی سی ہے پہاڑ میں گول مڑے ہوئے بانسوں کی شکل کو نمایاں کیا گیا ہے جب بانس کو گول موڑا جائے تو اس کے زور کو روکنے کے لیے ظاہر ہے کہ لکڑی کے ستونوں یا تھونیوں کو بجائے سیدھا عمودی طور پر قائم کرنے کے ذرا ڈھلواں سلامی نما قائم کیا جاتا ہوگا۔ پہاڑ میں ترشے ہوئے ابتدائی معابد میں ستونوں کی یہی وضع ہے۔ بعض چیتاؤں کے سامنے کا حصہ لکڑی ہی کا بنا ہوا تھا جس کے آثار امتداد زمانہ کے باوجود بہا جا اور کوندانہ میں اب تک موجود ہیں۔

پہاڑ میں تراشے ہوئے مندروں کی تعمیر کا سلسلہ ایک ہزار برس سے زیادہ جاری رہا۔ ان میں ساتویں صدی عیسوی تک تو زیادہ تر بدھ مت کے معابد ہیں۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی سے برہمنی مذہب کی عبادت گاہیں بھی تعمیر ہونی شروع ہوگئیں۔ انہی کے تقریباً ہم عصر جین مذہب کے معابد ہیں۔ بدھ مذہب کے معابد میں دوسری تیسری صدی عیسوی تک سوائے مذہبی علامات کے کسی قسم کی تزئین نہیں کی گئی۔ تاہم چھت اور ستونوں کی بلندی اور اندرونی ایوان کی وسعت کے لحاظ سے ایک خاص عظمت اور شوکت پائی جاتی ہے جو تعمیر کی عام سادگی سے مل کر دیکھنے والے کے دل پر عجب سکون اور مذہبی کیف پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن چوتھی صدی سے تزئین اور آرائش کا سلسلہ شروع ہو کر پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں

یہ کمال پر پہنچ گیا اور اجنٹا کے غار نشان ایک اور دو اور سولہ اور سترہ اور انیس اور چھبیس اس تزئین کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ در اور دیوار اور روکار دل کو نہایت کاری سے اس طرح سجایا ہے کہ صنعت کی صفائی، باریکی اور نفاست کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ سنگتراشی کی اس صنعت میں پھول پتوں اور پھلوں، جانوروں اور خیالی اشکال کے علاوہ انسانی پیکر بھی نہایت خوبی سے بنائے گئے ہیں جن میں صحیح ہیئت تناسب اور اندرونی احساسات کے دکھانے کا خاص التزام کیا گیا ہے۔ ان پیکروں سے صناع کی اعلیٰ ذہنیت اور بلند خیالی نظر آتی ہے۔ اجنٹا کے غاروں میں سنگتراشی کے علاوہ نقاشی کے کمال کے بھی بہترین نمونے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان فنون لطیفہ کے لحاظ سے تمام دنیا کے ممالک میں پیش پیش تھا۔ یہ دعویٰ اور مستحکم ہو جاتا ہے اگر میں آپ سے بیان کر دوں کہ کالی داس کے ڈرامے بھی اسی صدی میں لکھے گئے۔ سنگتراشی اور نقاشی کے اس کمال کے اسباب میں اول تو بدھ مذہب کی تعلیم تھی جس نے انسانی ہمدردی اور ایثار اور کائنات کی ہم آہنگی کی تعلیم دے کر امنگ اور جوش میں جو فنون لطیفہ کے لیے ضروری ہے ایک خاص لطافت سکون اور وقار پیدا کر دیا تھا علاوہ ازیں دوسری صدی قبل از مسیح سے پانچویں صدی بعد از مسیح تک ہندوستان میں مختلف بیرونی اقوام کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ مثلاً یونانی،

ساکا، کشان، شاہرات اور ہن ان بیرونی اقوام نے ہندوستان میں رہنے بسنے کے بعد بدھ مت اختیار کر لیا اور ان کے فنی کمال اور ذہنیت کی آمیزش اور تصادم نے دراوڑی نسل کی ذہنیت کے لیے ترقی کے راستے کھولدئے۔ علاوہ ازیں اس عروج میں آریائی نسل والوں کی بلند خیالی دقت نظر اور برّاقی طبع بھی کام آئی۔

مختلف اقوام کی آمیزش کا نتیجہ خود بدھ مت کے لیے اچھا نہیں ہوا اصلی سادگی خلوص اور ایثار باقی نہ رہا اور مذہب رسوم قصوں اور دیوتاؤں کے لفافے میں لپٹ گیا۔ یہ کمزوری چھٹی صدی سے شروع ہوئی ساتویں صدی میں مذہب بالکل بے جان ہوگیا۔ اور آٹھویں صدی کے آخر تک ہندوستان سے قریب قریب غائب ہوگیا۔ بدھ مت کے انحطاط کے آخری زمانہ میں برہمنی مذہب کو دوبارہ عروج دینے کے لیے شنکراچاری اور رام نوج کی تعلیم مفید ہوئی۔ بدھ مت تو ہندوستان سے بے شک غائب ہوگیا لیکن اتنا اثر اس کا مٹتے مٹتے ہوا کہ ہزاروں بیرونی اقوام کے لوگ جو بدھ مت کے پیرو تھے اس کے زائل ہونے کے بعد برہمن چھتری اور ویش بن گئے۔ یہ کایا پلٹ کاٹھیاواڑ، مالوا صوبہ جات متوسط برار اور دکن میں بہت زیادہ ہوئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ بھنڈارکر کی تحقیقات نہایت دلچسپ ہیں جنھوں نے مرہٹوں، گوجروں، جاٹوں وغیرہ کو ان

بیرونی اقوام کی نسل سے ثابت کیا ہے۔ مدراس کے برہمنوں کا بھی اپنے کو آریا تصور کرنا اسی قبیل میں داخل ہے۔

برہمنی مذہب کا دوبارہ عروج کس جوش و خروش، قوت اور استقلال بلند خیالی اور اولوالعزمی سے ہوا اس کے شاہد اس زمانہ کے مذہبی مجسمے ہیں جن کی بہترین مثال ہم کو ایلورہ اور ایلیفنٹا میں ملتی ہے شیو کا کیف انگیز ناچ، وشنو کا ایک ہی ڈگ میں دھرتی کو طے کر کے آکاش کی خبر لینا، بھیروں کی خون کی پیاس نہ بجھنا، راون کا کیلاش تک کو ہلا دینا، سنگتراشی کے ایسے نمونے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی قوت آسمان زمین دونوں کو تسخیر کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس مذہبی ہیجان اور ولولہ اور جوش کا کارنامہ تعمیر کی شکل میں ایلورہ کا کیلاش نامی مندر ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں راشٹرکوٹا خاندان کے راجہ کرشنا کے حکم سے پہاڑ میں تراشا گیا۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ ایتھنز کے پارتھینن (Parthenon) یا روم کے سینٹ پیٹر کو بنا لینا آسان ہے۔ کیونکہ کام کی نوعیت اور تقسیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن پہاڑ کے جگر میں بیسیوں برآمدے متعدد ایوان اور ہزاروں پتلے بنانا عقل کو دنگ کرتا ہے۔ کیونکہ سارا کام صرف ہتوڑی اور چھینی کا ہے اور اگر ایک کاریگر کا بھی ہاتھ بہک جاتا تو پھر اس حصہ کا درست ہونا ناممکن تھا۔ مساحت کے لحاظ سے اس عظیم الشان مندر

کا طول ۲۵۰ فیٹ، عرض ۱۵۰ فیٹ اور بلندی ۱۰۰ فیٹ ہے۔ وسطی حصہ میں جو ایوان ہے اس کے فرش کی جلا۔ ستونوں کے نقش و نگار اور موزونیت ہندوستانی کمال اور ذوق کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی صدی کا دوسرا کارنامہ ایلیفنٹا کی تری مورتی ہے۔ میں اس کے دیکھنے سے پہلے مصری رومانوی اور یونانی مجسموں کو دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس میں جو عظمت و شکوہ جلال و قہر اور جمال و سکون کی مختلف شانیں مورت کے تینوں چہروں میں دکھائی گئی ہیں وہ میری ناقص رائے میں دنیا کے کسی مجسمے میں نہیں۔ یونانی پیکروں میں جسمانی رعنائیاں ضرور ہیں لیکن یہ روحانی شان کہاں۔ رومانی تیلوں میں صرف حیوانی قوت اور زور ہے اور مصری مجسمے بھی بہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

پہاڑ کے تراشے ہوئے مندروں میں بہت سے جین مذہب سے بھی تعلق ہیں لیکن ان کا رتبہ تعمیری حیثیت سے پست ہے اور نقش و نگار اور تماثیل میں بھی محض نقالی پائی جاتی ہے۔ بلند خیالی اور تخلیقی قوت (Creative effort) معدوم ہیں۔

پہاڑ میں مندر تراشنے کا سلسلہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک ہزار برس سے زیادہ جاری رہا اور اس عرصہ میں سنگین دروازے چوکھٹیں، ستون، داسے، سرولین بنانے میں کمال مہارت ہوگئی۔ اور جب کھلے میدانوں میں عمارتیں بنانی شروع کیں تو ان میں

یا تو قدیم لکڑی کی عمارتوں کا تتبع کیا یا پہاڑ میں تراشے ہوئے مندروں کا ۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے کی جتنی عمارتیں ہیں ان کو اس طرح بنایا گیا ہے جیسے بچے لکڑی کے مکعب ٹکڑوں کا گھر بناتے ہیں ۔ بڑے بڑے پتھروں کو نہایت صفائی سے تراش کر ایک دوسرے کے اوپر جمایا گیا ہے اور اسی طرح چوکھٹوں اور دروازوں کو قائم کیا گیا ہے اور چھتوں کی سلوں کی بھی ترتیب دی گئی ہے لیکن چونکہ بنیاد اور وزن کا خیال نہیں رکھا گیا اور پتھروں کے بیچ میں مسالہ بھی نہیں ہے اس لیے جہاں کہیں بالائی حصہ زیادہ وزنی ہو گیا ہے سر دل فوراً تڑخ گئی ہے ۔ یا جہاں کہیں بنیاد دب گئی ہے عمارت کی دیواریں شق ہو گئی ہیں ۔ ہمارے سررشتہ کو ان عمارتوں کے تحفظ کے لیے جو تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں ان سب میں بنیاد کو پانی کے اثر سے محفوظ رکھنے اور مزید زمین میں دھنسنے سے بچانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور چھتوں کے وزن کو سہارنے کے لیے ستون اور تھونیاں قائم کرنی پڑتی ہیں اور پرانی سردلوں کو یا تو بدل دیتے ہیں یا نئی اور نصب کر کے ان کو تقویت دیدیتے ہیں ۔

فن تعمیر کے ان نقائص کے علاوہ ہندوستان کے معماروں نے اپنے فن میں آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک بے حد ترقی کی ۔ اجارے سے لے کر کنگنی تک عمارت کے ہر حصہ میں اتنا تنوع

پیدا کیا کہ ان کی بوقلمونی پر عقل حیران ہوتی ہے بعض محققین نے ہندوستان کے اس زمانہ کے معابد کی تقسیم ان کی برجیوں کی ہیئت کے لحاظ سے کی ہے مثلاً شمالی ہند جہاں برجیوں کی ہیئت ذرا لمبوتری بیرونی رخ پر گولائی لیے ہوئے ہوتی ہے، اور چنائی کے سلسلے عمودی طور پر نمایاں ہوتے ہیں ہندی آریائی کہا ہے، اور جنوب میں جہاں مندروں کے بالائی حصے ہرمی وضع کے ہوتے ہیں اور چنائی کے سلسلے افقی قائم کیے جاتے ہیں۔ دراوڑی کہا ہے۔ اور دکن میں جہاں برجیوں کی وضع بین بین ہے وہاں کے طرز تعمیر کو چالوکیا کہا ہے۔ یہ سب تقسیمیں محض اعتباری ہیں شمال اور جنوب دونوں جگہ کی برجیوں کا ماخذ اصل میں رتھوں کی برجیاں ہیں۔ جو شمالی ہند میں عام طور سے لمبوتری ہوتی ہیں اور جنوبی ہند میں چھتری کی طرح گول۔

اس زمانہ کی شمالی ہند کی بہترین عمارتوں میں بھنیشیور، کنارک کھجراہو اور آبو کے مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور دکن میں ان کے ہم عصر ورنگل، رامپا، اونڈھا اور اگی کے دیول ہیں جن کی صنعت اور خوبی اُسی پایہ کی ہے۔ جنوبی ہند میں اس زمانہ کے معابد میں ہالی بید بیلور کانجی ورم، سری رنگم اور تنجور کی عمارتیں ہیں جن سے فن تعمیر کی ابتدا ترقی اور عروج سب کا پتہ واضح طور پر چلتا ہے۔ اب میں ان عمارتوں میں سے بعض کی خصوصیات پر مختصر طور سے تبصرہ کروں گا

بھینشور میں کبھی سات ہزار دیول تھے اور اب بھی کئی سو کے آثار باقی ہیں۔ ان میں سے بعض چھٹی صدی کے بھی ہیں لیکن بڑا دیول جو لنگا راجہ کے نام سے مشہور ہے، غالباً آٹھویں یا نویں صدی کی تعمیر ہے اور اس کے سامنے کے حصہ میں جو ناٹ منڈپ اور بھوگ منڈپ ہیں وہ شاید اس کے بھی بعد کے ہیں یعنی گیارہویں اور بارہویں صدی کے ہیں۔ مندر کا برج تقریباً ۱۸۰ فیٹ بلند ہے۔ وضع لمبوتری ہے لیکن اس کو شمالی ہند سے مخصوص نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اسی قسم کے برج عالم پور ضلع ارچور میں بھی موجود ہیں۔ برج کے اس قدر حجم کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جو سنگتراشی کے کام سے خالی ہو۔ کام کی وضع نہایت نفیس ہے۔ بالائی حصہ پر ایک کمر کی گنبد بارہ شیروں کے مجسموں پر قائم کیا گیا ہے جس سے عمارت کی عظمت اور شان اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لنگا راجہ کے برج کے پاس ہی ایک اور برج ہے جس کی تعمیر میں چنائی کے سلسلے افقی ہیں جن کو فرگسن نے جنوبی ہند کی خصوصیت بیان کیا ہے۔ میں ابھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت کی تعمیر لکڑی کی تعمیر پر مبنی تھی اور برجوں کا گول یا لمبوترا بنایا جانا چنائی کے سلسلوں کا عمودی یا افقی ہونا محض عارضی امر ہیں۔

کام کی نفاست کے لحاظ سے کنارک کا سوریا کا مندر بھینشور کے مندر سے بھی بہتر ہے۔ یوربین ماہرین کی کتابوں میں اس کا ذکر

تیرھویں صدی بعد از مسیح

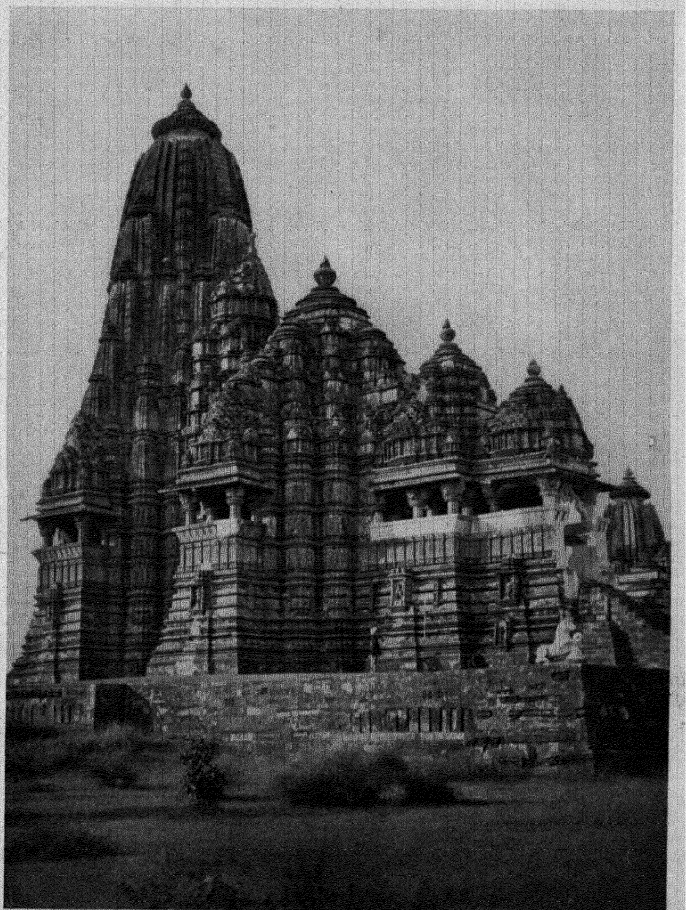

مہادیو جی کا مندر

کھجراؤ۔ علاقہ ریاست چھترپور

(Black Pagoda) سیاہ دیول کے نام سے کیا گیا ہے۔ مندر کی تعمیر سورج دیوتا کے رتھ کی صورت میں کی گئی ہے۔ چنانچہ حال میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے رتھ کے پہیئے اور گھوڑے برآمد ہو گئے ہیں۔ اس مندر میں اگرچہ فحش تصاویر کندہ کی گئی ہیں لیکن نبت کاری نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے تعمیر میں بھی تناسب کا بدرجہ اتم خیال رکھا گیا ہے۔ اس مندر کے برج میں بالائی حصہ کے استحکام کے لیے آہنی شہتیر بھی نصب کیے گئے تھے، جو پٹے ہوئے لوہے کے تھے۔ اگر برج کو نویں دسویں صدی کی بھی تعمیر مان لیا جائے تب بھی آہنی شہتیروں کا استعمال کچھ تعجب کی بات نہیں دہلی اور دھار میں اس زمانے سے قبل کی لوہے کی لاٹیں موجود ہیں۔ دکن میں لوہے کا استعمال بہت قدیم ہے اور روایت تو یہ ہے کہ اہرام مصری کے لیے بھی لوہے کے کنڈے ہندوستان ہی سے گئے تھے۔ یہ صحیح ہو یا غلط لیکن عرب کے جاہلیت کے شاعر تو ہندی تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ایران وغیرہ میں بھی ہندی لوہے کا جانا زمانہ قدیم سے ثابت ہے۔

اب میں کھجراؤ کے دیولوں پر تبصرہ کروں گا۔ کھجراؤ آج کل چھترپور کی ریاست میں ہے۔ لیکن یہ نہایت قدیم بستی ہے اور چینی سیاح ہوئین چوانگ نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے۔ کھجراؤ میں تیس مندر ہیں اور سوائے دو تین کے باقی سب دسویں یا گیارہویں صدی کے وسط کے بنے ہوئے ہیں۔

تعمیری لحاظ سے ان مندروں کی کرسی بہت بلند ہے سطحی نقشہ بھی بھینشور اور کنارک کے مندروں کے نقشہ سے بدلا ہوا ہے، یعنی پہلے داخلی حصہ (Porch) ہے۔ پھر بیچ کا منڈپ اور آخر میں مورت کا کوٹھا بھینشور اور کنارک کے دیولوں میں داخلی حصہ (Porch) مندر کی اصلی عمارت میں اس طرح شامل نہیں ہے۔ سنگتراشی کا کام نہایت نفیس ہے اور آرائشی کام اور مجسموں کی افراط ہے۔ آٹھ سو سے زیادہ پتلے جن کی ساخت انسانی قدوقامت سے نصف کے قریب ہے صرف کندریا (شیو) کے مندر میں موجود ہیں۔ اس دیول کے بالائی حصہ میں بُرجیوں کے متعدد ہونے سے ذرا بے عنوانی پیدا ہوگئی ہے اگر ایک برج ہوتا تو دیکھنے والے کو خلجان نہ ہوتا اور آنکھ برج کی ساخت اور اس کی نفیس سنگتراشی کا لطف اٹھا سکتی۔ کھجراؤ کے دیول شیو اور وشنو عقائد کے علاوہ جین مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی ظاہری ہیئت میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ آبو کے مندر بھی جین مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک معبد جس میں آدی ناتھ کی مورت ہے گیارہویں صدی کا بنا ہوا ہے اور دوسرا جس میں نیم ناتھ کا پتلا ہے تیرہویں صدی کا ہے دونوں عمارتیں سر سے پیر تک سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں اور سنگتراشی کا کام ایسا نازک اور نفیس ہے کہ پتھر کو موم کر دیا ہے۔ ستون، پرکالے، چوکھٹیں، سرولین چھت

نقش و نگار اور مورتوں سے آراستہ ہیں اور چپہ بھر جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں سنگتراشی کا کمال نہ دکھایا گیا ہو۔ آدی ناتھ کے مندر کے بیچ کے منڈپ کی چھت گنبد نما ہے اور ستونوں کے بیچ میں بھی ٹوڈے (Bracket) دے کر حلقہ دار محراب کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ اس زمانہ کی تعمیر میں چھت کے بنانے کے دو طریقے تھے۔ معمولی طور پر تو چار چار ستون قائم کر کے چھت کی تقسیم کر لی جاتی تھی اور سلیں پاٹ دی جاتی تھیں لیکن جہاں مربع حصوں کا طول اور عرض زیادہ ہوتا تھا اور خوشنمائی پیدا کرنی بھی منظور ہوتی تھی وہاں مربع جگہ کے چاروں کونوں پر آڑی سلیں رکھ کر ایک اور چھوٹا مربع بنا لیتے تھے اور اس کو ایک سادہ یا منبت پتھر سے ڈھانک دیتے تھے۔ بعض مقامات پر جہاں مزید آرائش منظور ہوتی تھی مربع کو آڑی سلوں سے دو دو تین تین بار چھوٹا کرتے تھے اور آخر میں ایک ایسی سل جس کا بیچ کا حصہ گول گنبد نما تراشا ہوا ہوتا تھا وسط میں نصب کرتے تھے جس سے چھت میں گنبدی اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ گنبدی چھت بنانے کا ایک اور بھی طریقہ رائج تھا۔ وہ یہ تھا کہ پہلے سولہ یا چوبیس ستونوں کو حلقہ کی شکل میں قایم کر لیتے تھے۔ اور پھر تراشیدہ پتھروں کے سلسلے سر دلوں پر اس طرح پر قائم کرتے تھے کہ اوپر کا حصہ بتدریج چھوٹا ہوتا جاتا تھا۔ پتھر ایک دوسرے سے چولوں اور کنڈوں سے پھنسے ہوئے ہوتے تھے۔ آدی ناتھ کے

منڈپ کی چھت بھی اسی طرح گنبدی بنی ہوئی ہے اور چونکہ اس کی نبت کاری نہایت نفیس ہے اس لیے تعمیری دلفریبی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں جین مت کے معابد میں یہ دونوں مندر سنگتراشی اور تعمیر کی صنعتوں کے بہترین نمونے ہیں۔

دکن کی عمارتوں میں سطحی نقشہ اور زیادہ دلکش نظر آتا ہے یعنی دیواروں میں داخلہ کا انتظام تین جانب سے رکھا گیا ہے۔ اس لیے دہلیزیں یا داخلی حصے (Porches) تین جانب بنائے ہیں اور چوتھی جانب توازن قائم رکھنے کے لیے مورت کا کوٹھا اور اس کا اگلا حصہ (Ante-chamber) ہوتا ہے۔ وسط میں حسب معمول منڈپ ہے لیکن وسعت کے لیے اس کے چاروں طرف ایک غلام گردش (Gallery) بنا دی ہے۔ ان لوازمات کی وجہ سے نقشہ باہر کے کسکوں سے مل کر بالکل ستارہ نما ہو گیا ہے۔ دیولوں کا بیرونی حصہ نبت کاری کے کام سے اسی طرح آراستہ ہے جیسا کہ کنارک اور کھجراؤ کے مندروں کا آراستہ ہے۔ لیکن دکن کے دیولوں کی گرہی اتنی اونچی نہیں ہے جیسا کہ کھجراؤ کے دیولوں کی ہے۔ اور جہاں کہیں زیادہ اونچی بھی ہے عمارت سے ملحق چاروں طرف چبوترہ بنا دیا گیا ہے جس سے عمارت کو استحکام بھی حاصل ہو گیا ہے اور غیر موزونیت بھی رفع ہو گئی ہے۔ دکن کے دیولوں میں ورنگل کا ہزار ستون کا دیول اور اٹگی کا مہادیو کا مندر

ستونوں کی مختلف اشکال اور سنگتراشی کے نفیس کام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ رامپا کے دیول میں ناچنے والیوں کی سیاہ پتھر کی مورتیں جھجّوں کے سہارے کے لیے نصب کی گئی ہیں۔ ان مورتوں کے انداز میں اصلیت کا رنگ بہت غالب ہے۔

ہالی بید اور بیلور کے مشہور دیول اگرچہ علاقہ میسور میں واقع ہیں لیکن ان کے سطحی نقشے اور بیرونی منبت کاری اور دیواروں کے کسکے بالکل دکن کے مندروں سے مشابہ ہیں اس لیے اب میں آپ کے سامنے صرف کانجی درم اور تنجور کے دیولوں کا ذکر کروں گا جن کی ساخت سے آپ کو ہندوستان کے وسطی زمانہ کی تعمیر کا حال اور زیادہ واضح ہو جائے گا

کانجی درم یا کانجی پور نہایت قدیم بستی ہے۔ یہ پالوّا خاندان کے بادشاہوں کی راجدھانی تھا۔ ایک زمانہ تک بدھ مت کے زیر اثر رہا۔ چینی سیاح ہوئین چوئینگ یہاں بھی پہنچا۔ چنانچہ اس نے ذکر کیا ہے کہ کانجی پور میں کئی سو بدھ مذہب کی عبادت گاہیں تھیں۔ اور اسّی مندر ہندو مذہب کے بھی تھے۔ پالوّا خاندان کے بعد یہاں چولا سلسلہ کے راجہ حکمراں ہوئے۔ کانجی درم میں اب بھی بہت سے دیول ہیں لیکن ان میں کیلاس ناتھ نامی جنوبی ہند کے فن تعمیر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کی وضع مہابلی پور کے پہاڑ میں ترشے ہوئے دھرم

راج رتھ سے بیحد ملتی ہے اور ہمارے اس نظریہ کی توثیق ہوتی ہے کہ ہندوستان کے فن تعمیر کا ارتقا مسلمانوں کے آنے سے قبل لکڑی کی عمارات اور پہاڑ میں تراشیدہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں سے ہوا تھا۔ ابتدا میں کانچی ورم کے اس دیول کا مورت کا کوٹھا منڈپ سے علیحدہ تھا لیکن بعد میں ایک اور منڈپ بیچ میں قائم کر کے تینوں کو آپس میں ملا دیا گیا۔ برج کا بالائی حصہ گول چھتری نما ہے اور نیچے کے حصہ میں کئی منزلیں ہیں جو درجہ بدرجہ مساحت میں کم ہوتی جاتی ہیں۔ ان منزلوں کی ساخت میں ستون اور نعل نما کھڑکیاں نمایاں ہیں جو بدھ مت کے معابد سے نقل کی گئی ہیں۔ اس مندر کے صحن کے اطراف میں جو حجروں کا سلسلہ ہے ان میں شیو عقیدہ کی مورتیں تقریباً اسی طرح نصب کی گئی ہیں جیسا کہ ایلورہ کے کیلاش میں ہیں جو پہاڑ میں تراشا ہوا ہے۔ جنوبی ہند کے بُرجوں کے بالائی حصہ کی وضع دو قسم کی ہے۔ ایک تو گول چھتری نما جس میں بعض اوقات چھتری کی کمانوں کو بھی دکھا دیا گیا ہے۔ اور دوسری پیپے نما (Barrel) یا بیل گاڑی کے اوپر کے ٹھاٹر کی شکل کی۔ دوسری شکل ان بُرجوں پر جو دروازوں پر بنائے گئے ہیں زیادہ نمایاں ہے۔

تنجور میں بھی بہت سے دیول ہیں لیکن وہاں کا بڑا مندر دسویں صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے شروع کا بنا ہوا ہے۔ یہ عبادت گاہ

شیو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ اصل مندر کی عمارت دو منزلی ہے۔ اور طول و عرض کے لحاظ سے ۸۲ فیٹ مربع ہے لیکن اس دو منزلہ عمارت پر جو برج قائم کیا گیا ہے وہ سطح زمین سے ۱۹۰ فیٹ بلند ہے اور اس کے تیرہ کھنڈ ہیں جن کی ہیئت مربع ہے اور بتدریج بالائی جانب ان کی مساحت کم ہوتی جاتی ہے سب میں اوپر چھتری نما گول گنبد ہے جو ایک ہی پتھر کا تراشا ہوا ہے تنجور کے اس دیول کے دروازے کے اوپر بھی برج ہے۔ لیکن وہ بہت بعد کا یعنی غالباً سولہویں صدی کا بنا ہوا ہے۔ جنوبی ہند کی عبادتگاہوں میں دسویں گیارہویں صدی تک جو برج اصلی مندر کی عمارت پر ہیں وہ دروازے کے برجوں سے زیادہ بلند ہیں اور یہ زیبا بھی تھا کیونکہ تقدس کے لحاظ سے اصل عمارت دروازہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن بعد کی عمارتوں میں دروازوں کے برج مورت کے کوٹھوں کے برجوں سے کہیں زیادہ بلند بنائے گئے ہیں۔ یہ سر بہ فلک عمارتیں جو جنوبی ہند کی اصطلاح میں گوپرم کے نام سے مشہور ہیں مدرا اور کمبا کونم کے دیولوں میں خاص طور سے قابل دید ہیں۔

مسلمان مکران میں تو ساتویں صدی ہی میں پہنچ گئے تھے اور ۷۱۲ عیسوی میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا۔ لیکن اسلامی فنون لطیفہ کی تاریخ ہندوستان کی سرزمین میں سلطان شہاب الدین غوری کے

عہد سے سمجھنی چاہیے جب قنوج اور اجمیر فتح ہوئے اور دہلی کے اسلامی دارالسلطنت کی بنیاد پڑی۔ یہ واقعات بارہویں صدی کے آخر اور تیرہویں صدی کے شروع کے ہیں۔ ٹھیک وہی زمانہ جہاں تک کی عمارات کی تاریخ میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔

مسلمان کس زور شور سے آئے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سوا سو ڈیڑھ سو برس میں ان کی سلطنت کابل سے لے کر آسام تک اور دہلی سے لے کر دولت آباد تک قائم ہو گئی۔ فن تعمیر کا انھیں خاص ذوق تھا اور مہندسی اور جرّ ثقیل سے خوب واقف تھے۔ مینار، گنبد اور محراب بنانے میں یہ پہلے ہی کمال حاصل کر چکے تھے۔ گچ کے استعمال کو بھی خوب جانتے تھے علاوہ ازیں ایران کے اثر سے اُنھوں نے چینی کے کام میں بھی کافی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اور شام کی ابتدائی حکومت کے زمانہ میں بازنتین کی پچیکاری کی صنعت سے بھی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ جب یہاں آئے تو فنی خصوصیات کا یہ تحفہ ہند کے اہل کمال کے لیے اپنے ساتھ لائے مسلمانوں کا پہلا تعمیری کارنامہ مسجد قوت الاسلام ہے۔ مسجد کا مینار جو قطب صاحب کی لاٹھ سے موسوم ہے آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک کے حکم سے شروع ہوئی ایبک اس زمانہ میں دہلی میں محمد بن غوری کے نائب کی حیثیت سے متعین تھا۔ مینار کی پانچ

منزلیں ہیں جن کو دہلی والے کھنڈ کہتے ہیں۔ پہلا کھنڈ ایبک کے وقت میں تعمیر ہوا اور باقی التمش کے عہد میں لیکن فیروز شاہ تغلق نے اوپر کے دو کھنڈوں میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا اور سب میں اوپر کے کھنڈ پر ایک چھتری بھی بنائی۔ پوری لاٹھ ۲۳۸ فیٹ بلند ہے۔ بالکل اسی زمانہ میں یعنی بارہویں صدی کے آخر میں جابر مہندس نے الموحد خاندان کے بادشاہ یعقوب بن یوسف کے حکم سے اشبیلیہ مراقش اور رباط میں مینار بنائے تھے جن کی عظمت اور شان اور استحکام کی اسلامی دنیا میں دھوم تھی۔ میں نے ان میناروں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان کی بلندی قطب صاحب کی لاٹھ سے ۰، فیٹ زیادہ ہے۔ لیکن خوبصورتی کے لحاظ سے ان کا دہلی کے مینار سے کوئی مقابلہ نہیں۔ افریقہ اور اسپین کے ان میناروں کی وضع نیچے سے اوپر تک مربع ہے۔ جس سے عمارت میں ایک قسم کی کاوا کی پیدا ہوگئی ہے۔ قطب کی لاٹھ میں معمار نے اول تو کھنڈوں کی وضع مختلف رکھی ہے اس کے علاوہ کتبوں کو اس خوبصورتی سے عمارت کے اطراف میں کندہ کیا ہے کہ نظر کو بے حد بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ عمارت کی تیاری میں ظاہر ہے کہ بیسیوں ہندی معمار مقرر کیے گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ابتدائی زمانہ تھا اور محمد غوری کے ساتھ سوائے چند استادوں کے زیادہ مہندس نہ آئے ہوں گے۔ سنگتراشی کے فن میں ہندی معماروں کو کمال حاصل تھا۔

ہزاروں وضع کے ستون تراشنا جانتے تھے۔ قطب صاحب کی لاٹھ پر کتبے جس طرح نبت کیے گئے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام ہندو معماروں کا ہے۔ کیونکہ بالکل اسی طرح وہ ستونوں پر نبت کاری کے آرائشی پٹے بنانے کے عادی تھے۔

مسجد قوت الاسلام کی محرابوں سے بھی ہندی معماروں کی صنعت ظاہر ہوتی ہے۔ محرابوں کے اطراف میں کتبوں کو انھوں نے اسی قرینے سے نبت کیا ہے جیسا کہ وہ مندروں کے دروازوں پر نقش و نگار بناتے تھے۔ علاوہ ازیں محرابوں کی تعمیر ڈاٹ کے اصول پر نہیں ہوئی۔ بلکہ پتھروں کو افقی سلسلوں میں نصب کرکے اوپر کی جانب اس طرح گھٹایا ہے کہ محرابی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ عمارت کا نقشہ بیشک کسی مسلم مہندس نے بنایا ہوگا۔ لیکن عمارت کی تکمیل ہندی معماروں کے ہاتھ سے ہوئی جیسا کہ ساخت اور آرائشی کام سے ظاہر ہے۔ اجمیر کی مسجد جو اڑھائی دن کے جھونپڑے کے نام سے موسوم ہے، مسلمانوں کی اولوالعزمی اور شان اور شوکت کا دوسرا کارنامہ ہے۔ محرابیں نہایت بلند اور خوش وضع ہیں لیکن فن تعمیر کے لحاظ سے ناقص ہیں کیونکہ ڈاٹ کے اصول پر نہیں بنائی گئیں۔ یہ غلطی مسلمان معماروں کی کمی کی وجہ سے واقع ہوئی ہندی معماروں نے ظاہر میں تو محراب کی شکل اسلامی وضع کی بنائی

ہے لیکن اصولاً وہ ٹھیک نہیں۔

دہلی میں اسلامی دار السلطنت قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ترکستان، ایران اور مغربی ایشیا سے مہندسین اور اہل کمال کے آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ مغلیہ سلاطین کے وقت تک جاری رہا جس کا پتہ ہم کو تاریخ سے ملتا ہے۔ ان مہندسین نے خالص اسلامی طرز کی عمارات بنانی شروع کر دیں جن کی بہت عمدہ مثالیں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کی مسجد اور علائی دروازہ ہیں۔ پہلی عمارت جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا درمیانی حصہ علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کا بنایا ہوا ہے۔ گنبد نیم کرہ کی شکل کا نہایت شاندار ہے اور اس کے زور کو روکنے کے لیے دیواروں کے بالائی حصہ میں جہاں گنبد قائم کیا گیا ہے چاروں کونوں میں چھوٹی محرابیں بنا دی ہیں۔ گنبد اور محراب میں تعمیر کے لحاظ سے بیرونی جانب ہٹنے کا میلان ہوتا ہے۔ اس میلان کو روکنے کے لیے یورپ کے مہندسین نے اپنے گنبدوں کے استحکام کے لیے باہر کی جانب پشتیبان بنائے ہیں لیکن یہ پشتیبان عمارت کی بیرونی ہیئت کو بدنما کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے تمام بڑے بڑے گنبدوں میں یہ عیب موجود ہے۔ مسلمان مہندسین نے گنبد کے اس میلان کو روکنے کے لیے

اندر چھوٹی چھوٹی محرابیں اور اقلیدسی اشکال بنائی ہیں۔ مسلمانوں کی اس تدبیر سے گنبد کا بیرونی میلان بھی رُک گیا ہے اور عمارت کے اندرونی حصہ میں ایک قسم کی رعنائی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ علائی دروازہ کے اندرونی حصہ میں یہ چھوٹی چھوٹی اقلیدسی اشکال نہایت خوبصورت طریقہ سے بنائی گئی ہیں جماعت خانہ اور علائی دروازہ دونو میں محرابیں نہایت موزوں اور متناسب ہیں۔ اور آرائشی کام نفیس نبت کاری اور جالیوں سے بھی ذوق کی نفاست عیاں ہے۔ علاوہ ازیں سنگ مرمر کی لوحوں کو سُرخ پتھر میں نہایت خوش سلیقگی سے نصب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر کے حُسن کو دوبالا کرنے کے لیے رنگ کے احساس کا شروع سے خیال تھا۔

خلجیوں کے بعد تغلق خاندان برسرِ حکومت ہوا۔ اِن کی عمارتوں میں استحکام اور قوت بیشک ہے لیکن رعنائی کی شان کم ہے۔ مثال کے طور پر غیاث الدین تغلق کا مقبرہ اور حوض خاص کی عمارات پیش کی جاسکتی ہیں۔ تغلق بادشاہوں کے عہد میں ہندی صنعت کا اثر کم پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تغلقی عمارتیں حُسن کے معیار کے لحاظ سے گری ہوئی ہیں۔

مسلمان اپنی قوت کے زور میں یوں تو صدی ڈیڑھ صدی میں سارے ہندوستان پر چھا گئے لیکن اس وسیع مُلک میں بُعد مسافت

اور نیز بڑے بڑے دریاؤں اور پہاڑوں کے حائل ہونے کی وجہ سے اپنی سلطنت کو منظم نہ رکھ سکے۔ اور چودھویں صدی میں دکن مالوا، گجرات جونپور اور بنگالہ میں صوبہ داری خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ان حصوں میں چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں موجود تھیں اور ان کے دوبارہ قیام کو گویا ہندوستان کے سیاسی نظام کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔ ان صوبہ دار مسلمان حکومتوں کے دارالخلافوں میں بھی اسلامی ممالک کے اہل کمال آتے رہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ مقامی صناعوں کے میلان کو روک سکتے۔ اس لیے سوائے چند عمارتوں کے ان سب مقامات میں ہندی صنعت کا اثر نمایاں ہے۔ صوبوں کے خالص وضع کی اسلامی عمارتوں میں گلبرگہ کے قلعہ کی جامع مسجد اور مانڈو کی بڑی مسجد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں عمارتوں میں طرز کی سادگی اور پاکیزگی کے علاوہ گنبد اور محرابوں کے سلسلوں کو اس کمال سے قائم کیا ہے کہ مذہبی عظمت و شان کے ساتھ ساتھ ایک روحانی اسراریت کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ گلبرگہ کی جامع مسجد ۱۳۶۷ء میں تعمیر ہوئی اور مانڈو کی مسجد اس کے کوئی اسّی برس بعد ۱۴۵۴ء میں۔

مخلوط طرز کی صوبہ داری عمارتوں میں بعض تو ایسی ہیں کہ اُن میں

ہندی طرز نبھ گیا ہے لیکن بعض میں بے قرینگی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً احمد آباد کی جامع مسجد میں ہندی طرز کے ستون اور محرابوں کا آرائشی کام ایسا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا لیکن اسی مقام پر محافظ خاں کی مسجد میں میناروں پر ہندی طرز کی آرائش اس افراط سے کی گئی ہے کہ ان کی ہیئت بالکل بدل گئی ہے اور عمارت میں ایک غیر موزونیت پیدا ہو گئی ہے۔

پندرھویں صدی میں دہلی اور اس کے نواح میں جو عمارات مرکزی حکومت کے ایما سے تیار ہوئیں ان میں ہندی اثر گو موجود ہے لیکن ایسا شیر و شکر ہو گیا ہے کہ بجائے بدمزہ ہونے کے خوشگوار معلوم ہوتا ہے اس قسم کی عمارتوں میں لودی اور سادات خاندان کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ ان کے گنبد تو ابتدائی زمانہ کے نیم کروی شکل کے ہیں لیکن ان کے بھاری پن کو کم کرنے کے لیے برج کے اطراف میں چھوٹی چھتریاں بنائی گئی ہیں اور نفس عمارت میں بھی چینی کے کام پتھر کی جالیوں اور چونے کے آرائشی نقش و نگار سے لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے

۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پر بابر کی فتح ہندوستان کے فن تعمیر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ لیکن اس کا

نمایاں اثر ہم کو اکبر کے عہد تک نہیں ملتا - وجہ یہ ہے کہ بابر اور اُس کے بیٹے ہمایوں کو سلطنت کے ایسے جھگڑے رہے کہ فن تعمیر میں خاطر خواہ اصلاح کرنے کا موقع نہ ملا - بابر تو اپنے توزک میں ہندی صنعت کی تعریف کرتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ عمارتوں میں ہم آہنگی اور کاملیت نہیں ہے جو بالکل درست ہے - مُغلوں کے زمانہ سے پہلے کی ہندوستان کی تمام عمارتوں میں کوئی نہ کوئی نقص اور بیڈھنگا پن ضرور موجود ہے -

اکبر کے عہد کے فن تعمیر کا ذکر کرنے سے پہلے شیر شاہ کے زمانے کی دو عمارتوں پر تبصرہ کرنا ضروری ہے - ان میں ایک تو خود اس کا مقبرہ ہے جو سیسرام میں واقع ہے اور دوسری دہلی کے پُرانے قلعہ کی مسجد ہے جس کو شیر شاہ نے ۱۵۴۷ء میں تعمیر کیا تھا - ان دونوں عمارتوں میں لودی اور سادات خاندان کے وقت کی تعمیری خصوصیات کے علاوہ کوئی نئی چیز نہیں ہے - لیکن اُنہی پُرانی تیلیوں کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ دونوں عمارتوں میں سنگینی اور رنگینی جلال اور جمال کی خاص کیفیتیں پیدا ہوگئی ہیں -

مغل بادشاہ جیسا انسانی کمال کے قدردان تھے ویسے ہی قدرتی مناظر کے شیدائی تھے - اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنی عمارات میں آرائش

اور تزئین کے لیے باغوں اور نہروں کا اضافہ کیا۔ یونانیوں کی طرح ان کو یہ بھی خیال تھا کہ عمارت کی شان کے لیے عمدہ پتھر کا بھی ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے سنگ مرمر کو خوب رواج دیا۔ پچیکاری کی صنعت ان کے آنے سے پہلے ہند میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کو اپنے نفیس ذوق سے اور کمال کو پہنچایا۔ جالیوں اور مرغولوں کے کام میں ہندی سنگتراش پہلے ہی سے ماہر تھے۔ لیکن ان کی سرپرستی اور نگرانی میں ان کا فن اور چمک گیا۔ گنبد اور محراب اور مینار کی شکلوں میں بھی ایسی اصلاح کی کہ وہ تناسب اور موزونیت کا نمونہ بن گئیں اس مختصر عام تنقید کے بعد میں آپ کے سامنے مغل بادشاہوں کی بعض عمارات کا ذکر کرتا ہوں۔

سب میں پہلے ہمایوں کے مقبرہ کی کیفیت سنیئے۔ اس میں باغ، چبوترہ، عمارات کی روکار کی بلند محرابیں اور گنبد کی شکل سب نئی چیزیں ہیں۔ اور ان سب نے مل کر عمارت میں عظمت اور شان اور ایک خاص رعنائی پیدا کر دی ہے۔ سنگ مرمر کا استعمال بھی پہلی عمارتوں سے زیادہ ہے اور گنبد تو سارا سنگ مرمر کا ہی بنا ہوا ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ اکبر کے عہد کا پہلا کارنامہ تھا اس کے بعد فن میں اور ترقی ہوئی۔ چنانچہ فتح پور سیکری کی مسجد اور اس کا

سولھویں صدی بعد از مسیح

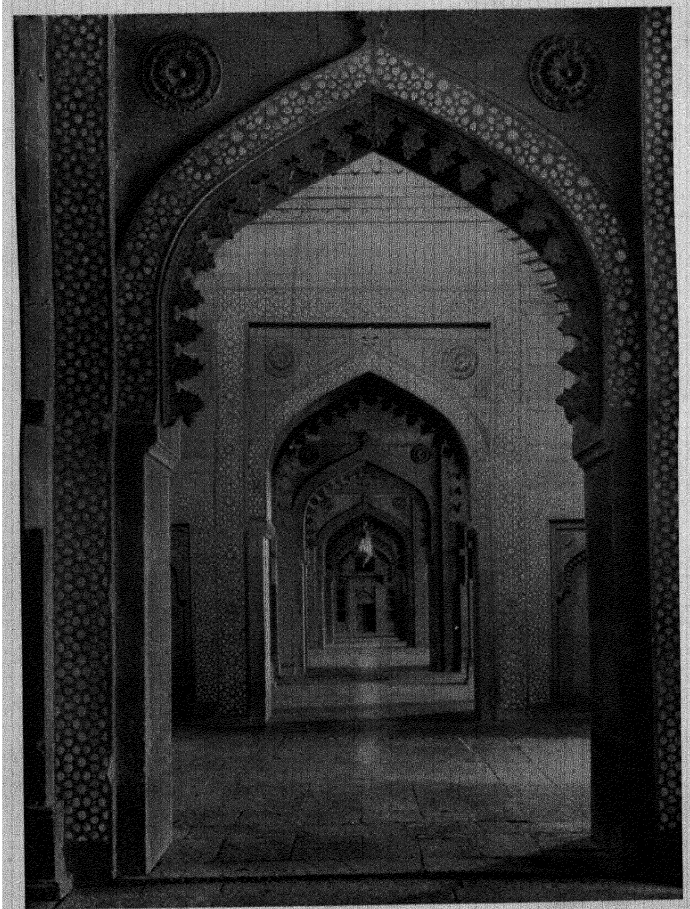

مسجد درگاہ حضرت شیخ سلیم چشتی

فتح پور سیکری

عالی شان دروازہ جو اپنی رفعت کے لحاظ سے بلند دروازہ کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں نفاست ذوق، اولوالعزمی اور صنعتی کمال کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مسجد کے اندرونی ایوان میں اگر ہم جنوبی جانب کھڑے ہو کر کمانوں کے سلسلہ کو دیکھیں تو ان کے تناسب اور سنگ مرمر کے نفیس کام پر بے اختیار سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بلند دروازے کو کہتے ہیں اکبر نے خاندیس کی فتح کی یادگار میں تعمیر کیا تھا۔ سطح زمین سے کنگرہ تک اس کی بلندی ۱۷۶ فیٹ ہے۔ اگر ایسی تعمیر کے بعد اس کے دل میں 'جل جلالہ' کا جذبہ پیدا ہوا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔

۱۵۶۹ء میں اکبر نے فتحپور سیکری کا نیا شہر تعمیر کرنا شروع کیا اور پندرہ سال تک عمارتیں بنتی رہیں۔ ان میں ہندی صنعت کو بے حد فروغ ہوا۔ چنانچہ جودھا بائی کے محل، بیربل کے مکان، دیوان خاص اور سلطانہ کے نشیمن میں ہندی فن تعمیر اور ہندی سنگتراشی نہایت دلپذیر صورتوں میں نمایاں ہیں۔ فتح پور سیکری میں پنچ محل کی ساخت بھی ذرا نرالی ہے اور ہندی وضع کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں اکبر کا مقبرہ جو جہانگیر کے وقت میں تعمیر ہوا اس کی وضع بھی اسی طرح پنج منزلہ ہے۔

جہانگیر کے وقت میں تعمیر کی نفاست اور بڑھی۔ سنگ مرمر کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔ اور عمارت کی زیبائش کے لیے

۱۱۰۵۲۴

پچیکاری کی صنعت کو فروغ ہوا۔ اس عہد کی تدریجی ترقی سمجھنے کے لیے سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مزار دونوں بہترین عمارتیں ہیں۔

۱۶۲۸ء میں شاہِ جہاں تختِ سلطنت پر متمکن ہوا اور ۳۰ سال تک حکمراں رہا۔ تعمیر کا بیحد شوق تھا اور ذوق بھی نہایت نفیس پایا تھا۔ شہر بسایا، قلعے بنائے، مسجدیں تعمیر کیں اور سب میں زیادہ اپنی چاہیتی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ بنایا جو عجوبۂ روزگار ہوگیا۔ آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کی بہت سی عمارتیں تھیں ان سب کو توڑ کر سر سے پیر تک سنگ مرمر کا بنایا۔ آگرہ کے قلعہ میں دیوان عام، دیوان خاص، خاص محل، شیش محل، مثمن برج، انگوری باغ، موتی بھون اور موتی مسجد شاہ جہاں ہی کے تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح لاہور کے قلعہ میں بارگاہ، چہل ستون، مثمن برج، خواب گاہ اور نولکھا شاہ جہاں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان عمارتوں کی نفاست اور پچیکاری کی خوبصورتی کا بیان کرنا زبان سے مشکل ہے۔ آگرہ کے مثمن برج کی لطافت کو دیکھ کر کون سا بد ذوق انسان ہوگا جس کے دل اور آنکھوں کو سرور حاصل نہ ہو۔ یہی حال بی بی کے روضہ کا ہے۔ فادر منریک نے تو اس کو وینس کے ایک ہندس جرونیمو ویرونیو ہی

کے تخیل کا نتیجہ لکھدیا - خدا کا شکر ہے کہ فارسی زبان میں ایسی تاریخیں موجود ہیں جن میں اس عمارت کی مفصل کیفیت اور بنانے والوں کے نام درج ہیں اور سب میں زیادہ تو خود عمارت کی ساخت ہی جو بآواز بلند کہہ رہی ہے کہ میں اسی مُلک کے صنعت اور کمال کا نمونہ ہوں۔ جو اصحاب فن تعمیر سے واقف ہیں اُن سے کہا جاسکتا ہے کہ اس عمارت کا نقشہ بیش و کم وہی ہے جو ہمایوں اور خانخاناں کے مقبروں کا ہے مینار ہم کو ہمایوں کے مقبرہ میں نظر نہیں آتے لیکن اکبر کے مقبرہ میں جو سکندرہ میں واقع ہے یہ موجود ہیں۔ تبدیلی اتنی ہے کہ دروازے سے لے کر ان کو چبوترے پر نصب کیا ہے۔ ہمایوں کے مقبرہ میں گنبد کی ہیئت ذرا بھاری تھی تاج محل میں اس کو شلغمی صورت کا بنا کر ثقالت کو رفع کردیا ہے۔ پچیکاری کی صنعت اکبر کے زمانہ میں ہی خاصی فروغ پاگئی تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں اس کو اور ترقی ہوئی اور شاہجہاں کے زمانہ میں کمال کو پہنچ گئی۔ شاہ جہاں نے عمارت کی تکمیل کے لیے اہل فن کو دور دور کے ملکوں سے بلایا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ان صاحبان کمال کے نام درج ہیں۔ اس ضمن میں پچیکاری کے کام کے لیے کسی نیپلز یا وینس کے کاریگر کو بھی نوکر رکھ لیا ہو تو تعجب نہیں لیکن یہ ادعا کہ ساری عمارت کسی اطالوی کی بنائی ہوئی ہے

ذرا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ اس وقت کے اطالیہ کے طرز تعمیر کو دیکھتے ہیں جو بیروک (Baroque) کے نام سے مشہور ہے تو بھدّے پن اور بد ذوقی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

شاہِ جہاں کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اس کی ساری زندگی سیاسی مہموں کے طے کرنے میں گزری۔ اس لیے فن تعمیر میں کوئی خاص ترقی نہ ہوئی۔ اورنگ زیب کے بعد اس کی اولاد اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار اور زیادہ جھگڑوں اور کش مکش میں مبتلا رہے۔ چنانچہ ان کی کمزوری اور مُلک میں بدامنی کی وجہ سے فن میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اور آخر نوبت یہ پہنچی کہ ہندوستان کے فن تعمیر کا نمونہ فوج کی بارکیں ڈاک بنگلے اور عدالتوں اور دفتروں کی عمارتیں بن گئیں۔

حضرات۔ میں اشوک کے زمانہ سے لے کر شاہ جہاں کے زمانہ تک تقریباً دو ہزار سال کی داستان آپ کو سنا چکا۔ تنقید کرتے وقت حسن و قبح دو نو پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ لیکن آپ کی قدیم یادگاریں ایسی نہیں کہ آپ دنیا کے دوسرے ممالک کی یادگاروں سے ان کا مقابلہ کرنے میں کسی طرح شرمائیں۔ مثلاً اگر اہل عراق بابل اور نینوا کی حیوانی تماثیل پر فخر کرتے ہیں تو آپ بھی سارناتھ اور سانچی کے

شیروں اور ہاتھیوں کے مجسموں پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگر اطالیہ کے رہنے والوں کو پومپیائی اور سائنیا کی قدیم تصاویر پر گھمنڈ ہے تو آپ بھی اجنٹا کی نقاشی پر گھمنڈ کر سکتے ہیں۔ اگر اہل مصر کو ابوالہول اور کارنک کے معبد کی عظمت و شکوہ اور جبروتی شان پر غرور ہے تو آپ بھی ایلورہ کے کیلاش کی عظمت و شکوہ اور ایلی فنٹا کی تری مورتی کی جمالی اور جلالی شان برلن ترانی کر سکتے ہیں۔ اگر یورپ والے اپنے قوطی طرز (Gothie Style) کے گرجاؤں کے فن تعمیر پر فخر کرتے ہیں تو آپ بھی مدرا اور تنجور، کمبا کونم اور ہالی بید کے دیولوں کے سر بفلک دروازوں اور اعلیٰ سنگتراشی پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگر اہل ہسپانیہ کو اشبیلیہ غرناطہ کے محلات کی نفاست اور خوبصورتی پر ناز ہے تو آپ بھی تاج محل اور آگرہ کے شمن برج کے حسن و جمال پر ناز کر سکتے ہیں۔ مقابلہ کا سلسلہ اس طرح اور جاری رکھا جا سکتا ہے اور آپ انشاء اللہ کسی ملک سے ہیٹے نہ رہیں گے۔

ہاں اتنا یاد رہے کہ ہماری یہ مایۂ ناز یادگاریں ہندوستان کی مختلف النسل قوموں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہیں۔ آپ ابھی مجھ سے سُن چکے ہیں کہ پچھلے تین چار ہزار برس میں کتنی مختلف قومیں یہاں آئیں اور کس طرح یہاں آباد ہو کر آپس میں شیر و شکر ہو گئیں ہماری تہذیب

اور تمدن ایک شاندار درخت ہے جس کے برگ و بار مختلف قوموں کی آبیاری سے نمودار ہوئے ہیں۔ آج کل بدبختی سے فضا بہت خراب ہے اور نفسانفسی کے جھکڑ چل رہے ہیں مجھے ڈر ہے کہ ہمارا محبت اور آشتی سے پروان چڑھا درخت کہیں ان آندھیوں کی نذر ہوکر ریشہ ریشہ نہ ہوجائے۔ اور پھر وہ ریشے نہ لنگوٹی کے کام آسکیں اور نہ تہ بند کے۔

حضرات ہمارے بادشاہ ذیجاہ حضور نظام اور اُن کے وزیر باتدبیر سر اکبر حیدری کو ہندوستان کی قدیم تہذیب کے بچانے اور آئندہ ترقی دینے کا بے حد خیال ہے اور اسی وجہ سے لکھوکھا روپیہ مملکت دکن کے قدیم یادگاروں کو محفوظ کرنے کے لیے خرچ کیا گیا ہے۔ یہ یادگاریں بدھ مت سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور جین مت سے بھی۔ شیو عقیدے سے بھی اور وشنو عقیدے سے بھی۔ مسلمانوں سے بھی عیسائیوں سے بھی لیکن سب اسی ملک کے فن و کمال اور عقل و دانش کا کارنامہ ہیں۔ اعلیحضرت واقدس کا خیال ہے کہ جب سیاسی فضا صاف ہوجائے گی تو ملک کی آئندہ ترقی کے لیے یہ قدیم یادگاریں بہت حوصلہ افزا ثابت ہوں گی۔ حال میں مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ سرجان مارشل کی معیت میں ہندوستان کے قدیم آثار کی ایک جامع تاریخ لکھوں۔ چنانچہ آج کل ہم دونو اسی کام میں مصروف ہیں۔ دعا فرمائیے کہ یہ کام نیک نیتی سے انجام پائے۔

۹۱۳۵۴
تخ - ھ
آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیر انہ لیا جائیگا۔